

پاکستان کو ایک مذہبی ریاست ہونا چاہیے

[یہ ایک مباحثہ ہے جو مئی ۱۹۴۷ء میں ریڈیو پاکستان، لاہور سے نشر ہوا تھا۔ اس مباحثہ میں مسائل کی حیثیت سے جناب وجیہ الدین صائب بول رہے تھے اور مجیب کی حیثیت سے ابو الاعلیٰ مودودی۔]

مس۔ اس بحث کو شروع کرنے سے پہلے غالباً یہ جان لینا ضروری ہے کہ آپ کے ذہن میں مذہبی ریاست کا کیا تصور ہے ؟

م۔ ظاہر بات ہے کہ ایک مسلمان جب مذہب کا لفظ بولے گا تو اس کے ذہن میں اسلام ہی مراد ہوگا۔ میں جب کہتا ہوں کہ پاکستان کو ایک مذہبی ریاست ہونا چاہیے تو اس سے میرا مطلب یہ ہوتا ہے کہ اسے ایک اسلامی ریاست ہونا چاہیے یعنی ایک ایسی ریاست جو اخلاق، تہذیب، تمدن، معاشرت، قانون، سیاست اور معیشت کے ان اصولوں پر قائم ہو جو اسلام نے ہم کو دیے ہیں۔

مس۔ آپ نے مذہبی ریاست کا جو مفہوم بیان فرمایا ہے اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس ریاست کا سیاسی اقتدار ماہرین دینیات کے ایک مخصوص طبقے کے ہاتھ میں ہوگا۔ اس طبقہ کا کام یہ ہوگا کہ وہ سیاسی اور اقتصادی امور کے بارے میں اسلامی نقطہ نظر سے تحقیق و تفتیش کرے، ریاستی قوانین وضع کرے اور شرعی احکامات کی بنا پر ہر سیاسی گتھی کو سلجھائے۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اس طبقے کی پشت پناہ کون لوگ ہونگے ؟ یہ تو آپ جانتے ہی ہیں کہ اقتصادی لحاظ سے ہماری سماج مختلف طبقوں میں منقسم ہے۔ ہر طبقہ اس کوشش میں ہے کہ اپنے مقاصد کے حصول کے لئے مذہبی جواز تلاش کرے اور مذہبی نعروں کو استعمال میں لائے۔ ماہرین دینیات اس طبقاتی کشمکش سے بے نیاز اور غیر متعلق نہیں رہ سکتے۔ ان کے لئے لازم ہے کہ یا تو وہ عوامی طاقتوں کا ساتھ دیں، یا اپنے آپ

کو سرمایہ دار اور جاگیردار طبقہ سے وابستہ کر دیں۔ اس صورت میں قرآنی اصولوں کی جو بھی تفسیر پیش کی جائیگی وہ اُن کے سیاسی رجحان کی آئینہ دار ہوگی۔ مختلف سیاسی خیالات رکھنے والے مفسروں میں اہم ترین مسائل پر شدید ترین اختلاف رائے پیدا ہو جائے گا۔ اقتصاد کی کشمکش ایک لاتناہی نقیبانہ بحث کی صورت اختیار کر لے گی۔ اور وہ مسائل جن کا مناسب حل ڈھونڈنا اس وقت اشد ضروری ہے جن کے توں دھڑے کے دھڑے رہ جائیں گے۔

ہم جس طبقاتی کشمکش کی طرف آپ اشارہ فرما رہے ہیں وہ دراصل پیدا ہی اس لئے ہوئی ہے کہ متمدن سے غیر اسلامی اثرات کے تحت رہتے رہتے ہمارا معاشرہ اخلاق کی اُس روح سے اور انصاف کے اُن اصولوں سے محروم ہو گیا ہے جو اسلام نے ہم کو دیے تھے۔ جس مادہ پرستی نے دنیا کے دوسرے معاشروں کو طبقات میں تقسیم کیا اور ان کے درمیان اغراض و مقاصد کا تضاد پیدا کیا وہی قسمتی ہے اب ہمارے معاشرے کو بچاؤنے اور باہم ٹکرائیے کی دھمکیاں دے رہی ہے۔ ابھی ابھی ہم فرقہ وارانہ کشمکش کے ہونا ک تلخ بھگت چکے ہیں اور اُس سے لگے ہوئے زخم ابھی جھوٹے بھی نہیں ہیں۔ اب ہم اس کے لیے تیار نہیں ہیں کہ اپنے آپ کو اُن اجتماعی فلسفوں کے حوالہ کر دیں جو ہمارے اندر ایک دوسری جنگ۔ طبقاتی جنگ۔ برپا کر دیں اور ہمیں اُس وقت تک امن کی صورت نہ دیکھنے دیں جب تک ہمارا کوئی ایک طبقہ دوسرے طبقوں کو ملیا میٹ نہ کر دے۔ دوسری قوموں نے تو ان اجتماعی فلسفوں کو شاید اس لئے قبول کر لیا کہ اُن کے پاس اخلاق اور انصاف کے وہ اصول موجود نہ تھے جو طبقاتی خود غرضیوں کے نشو و نما کو رد کر سکتے اور مختلف عناصر کو ایک عادل برادری میں جمع کر دیتے۔ لیکن ہم خوش قسمتی سے ایک ایسا نظام حیات رکھتے ہیں جو ہمیں اس خطرے سے بچا سکتا ہے۔ ضرورت صرف اس امر کی ہے کہ ہم اپنے اندر سے اُن لوگوں کو اُٹھا لیں جو اسلام کی روح کو پوری طرح سمجھتے ہوں اور طبقاتی تعصبات سے بالاتر ہو کر اسلام کے قوانین کی بے لاگ تعبیر کر سکتے ہوں۔ پھر یہ لوگ بالاتفاق، یا اکثریت کے ساتھ، جو تعبیر ہمارے سامنے پیش کریں اسے ہم سب مان لیں اور ہم میں سے کوئی طبقہ اپنے ہی مطلب کی تعبیر پیش نہ کرے۔ ایسے لوگوں کی پشت پناہی

پوری قوم کو بحیثیت مجموعی کوئی چاہیے نہ کہ کسی ایک طبقے یا چند طبقوں کو۔ ہمیں اُن کے انتخاب میں صرف اس معیار کو ملحوظ رکھنا چاہیے کہ وہ بھرپور سے کئے قابل سیرت رکھتے ہوں، اور اسلام کی صحیح تعبیر کرنے کے اہل ہوں۔

میں میری ناچیز رائے میں سیاسی نظام کے مزب کرنے میں صرف خلوص اور ایمان داری ہی سے کام نہیں چل سکتا۔ ہمارے سامنے اس وقت بہت سے پیچیدہ سیاسی اور معاشی مسائل ہیں جن پر سمجیدہ غور و فکر کی ضرورت ہے۔ ذرائع پیداوار کو قومی ملکیت قرار دیا جائے یا شخص ملکیت، ریاست میں ایک ہی سیاسی پارٹی ہونی چاہیے یا ایک سے زیادہ سیاسی پارٹیوں کا ہونا جمہوریت کے لیے ضروری ہے؟ مزدوروں کو ہڑتال کا حق ہونا چاہیے یا نہیں؟ وغیرہ وغیرہ۔ آپ ان گنتیوں کو مذہبی پیشواؤں کے حوالہ کر دیجیے، آپ دیکھیں گے کہ وہ کسی فیصلہ کن نتیجے پر نہیں پہنچ سکتے۔ اس کی سب سے بڑی وجہ یہی ہے کہ ریاست کی تعمیر کے لیے حقیقیانہ تحقیق و تجسس اور مذہبی کتب کی چھان بین کے بجائے سیاسی تجزیے اور تاریخی شعور کی ضرورت ہے۔ اس سلسلہ میں دنیا کے ماہروں کی بنسبت سیاسیات اور اقتصادیات کے ماہرین ہماری بہتر رہنمائی کر سکتے ہیں۔

ہم آپ جب ”دینیات“ کا لفظ بولتے ہیں تو شاید ”دیویات“ کو اس سے خارج کر دیتے ہیں۔ اسی لیے آپ کو بجا طور پر یہ اندیشہ ہوا کہ اگر ہم نے اپنے سیاسی اور معاشی مسائل کا حل اُن ماہرین دینیات کے حوالہ کر دیا جو دیویات سے ناواقف ہیں تو سچا کوئی مسئلہ بھی حل نہ ہو سکے گا۔ لیکن آپ فرما اس پہلو پر بھی غور فرمائیے کہ اگر ہم نے اپنے قدموں، اپنی سیاست اور

اب وقت کی کمی کے باعث سائل کو اس شبہ کا تفصیلی جواب نہ دیا جاسکا کہ اسلامی ریاست کو چلانا کسی مخصوص ”مذہبی طبقے“ کا کام ہوگا۔ سائل نے یہ شبہ مسیحی تہذیب کی سی اور پاپائی نظام اور پریسٹ ہڈ سے اخذ کیا تھا اور اس کا تفصیلی جواب ریڈیو کی مختصر گفتگو میں ممکن نہ تھا۔ یہاں اشارہ صرف اتنا ہی بتانے پر اکتفا کیا گیا ہے کہ اسلامی ریاست کے چلانے والے لوگوں کو عوام الناس اپنے دلوں سے منتخب کریں گے اور یہ انتخاب ان کی سیرت اور قابلیت کے لحاظ سے ہوگا نہ کہ کسی طبقہ کی رکنیت کے لحاظ سے۔

اپنی معیشت کے مسائل اُن ماہرین دینیات کے حوالہ کیے جو صرف مغربی نظریات و عملیات سے واقف ہیں اور اسلامی تعلیمات سے کوئی مس نہیں رکھتے تو ہم کہاں پہنچیں گے۔ آپ کہتے ہیں کہ یہ لوگ ماہرین دینیات کی یہ نسبت ہماری بہتر رہنمائی کر سکیں گے۔ لیکن مجھے اندیشہ ہے کہ یہ رہنمائی ہمیں اُسی منزل پر لے جائے گی جس پر آج دنیا کی بڑی بڑی قومیں پہنچ چکی ہیں، یعنی گھر کے اندر طبقاتی خود غرضیوں کی کشائش، اور گھر کے باہر بین الاقوامی خود غرضیوں کی کھینچ تان۔ کیا اس سے بہتر یہ نہ ہوگا کہ ہم اپنی قوم میں اُن لوگوں کو تلاش کریں جو دین اور دنیا، دونوں کو اچھی طرح جانتے ہوں، جن کی نگاہ قرآن و حدیث کی تعلیمات پر اور سیاسیات و معاشیات وغیرہ کے مسائل پر یکساں ہو، اور وہ سر جوڑ کہ ہماری گتھیوں کا ایسا حل پیش کریں جو ہماری قومی زندگی کو ساری دنیا کے لیے ایک قابل تقلید نمونہ بنا دے۔

س۔ ریاست پاکستان کو اسلامی شریعت کے مطابق تنظیم دینے اور شرعی احکامات کا موجودہ حالات پر اطلاق کرنے میں ہمیں ایک اور مشکل پیش آئے گی۔ ہم بسا اوقات مذہبی احکامات کی روح کو فراموش کر دیتے ہیں اور اُن کی لفظی حیثیت ہمارے پیش نظر رہتی ہے۔ اس طرح وسائل اور مقاصد ایک دوسرے سے غلط ملط ہو کر رہ جاتے ہیں۔ سود ہی کو بھیجے۔ سود کو ناجائز قرار دینے کا مقصد یہی تھا کہ اقتصادی استحصال کو روکا جائے۔ اسی طرح اجارہ، احتکار اور چور بازاری کی مخالفت کی گئی۔ لیکن جائز تجارت کو روکا رکھا گیا۔ کیونکہ اُس زمانے میں سرمایہ داری نظام ابھی طفولیت کی حالت میں تھا اور صنعتی سرمایہ کی طرح ظلم و استبداد کا آلہ نہ تھا۔ آج حالات بدل چکے ہیں۔ آج بیرونی تجارت کا مفہوم یہ ہے کہ سامراجی نظام کو تقویت دی جائے اور دوسری قوموں کو اقتصادی اور سیاسی طور پر محکوم بنایا جائے۔ جائز اور ناجائز تجارت کا فرق مٹ چکا ہے۔ لیکن ہمارے علماء جب اقتصادیات پر فتویٰ لگاتے ہیں تو وہ یہ بھول جاتے ہیں کہ موجودہ اقتصادی نظام میں جہاں سود کی کوئی اہمیت نہیں ہے۔ غربت اور بد حالی اس نئے کی پیداوار ہے جسے وہ جائز قرار دیتے ہیں یعنی صنعتی سرمایہ داری اور میننگ۔

م۔ یہ خرابی جس کا آپ ذکر فرما رہے ہیں ہر اُس جگہ پیدا ہو جاتی ہے جہاں قانون کے منشا اور اس کی روح کو چھوڑ کر صرف اُس کے الفاظ لے لیے جاتے ہیں۔ کہیں یہ خرابی علم اور بصیرت کی کمی کی وجہ سے پیدا ہوتی ہے، اور کہیں اس وجہ سے کہ لوگ اپنی اغراض کے لیے قانون کی روح سے بیجاوت کرنا چاہتے ہیں مگر ظاہر داری کو قائم رکھنے کے لیے قانون کی شکل بدلنے سے احتراز کرتے ہیں۔ ہمیں اس خرابی سے اگر کوئی چیز بچا سکتی ہے تو وہ صرف یہ کہ عام مسلمانوں میں اسلام کا شعور اور اس کی واقعی پیروی کا اہواہ موجود ہو۔ یہ چیز جب موجود ہوگی تو وہ اسلامی قوانین کی تعبیر کے لیے اپنے اندر سے انہی لوگوں کو منتخب کریں گے جو قرآن و سنت کے بعض الفاظ ہی نہ جانتے ہوں بلکہ اُن کی روح کو بھی سمجھتے ہوں۔

س۔ شریعت کے مفسرین اور شارحین میں سیاسی اختلافات کے علاوہ جو خالصتہ مذہبی اختلافات ہیں۔ اُن کے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے؟ کیا آپ کی نظر میں یہ اختلافات مستقل کے سیاسی اور سماجی نظام کا تصور قائم کرنے میں رکاوٹ نہ ڈالیں گے؟

م۔ ان اختلافات کی نوعیت وہی کچھ ہے جو ہمارے دوسرے اختلافات کی ہے۔ اور انہیں بھی ہم اُسی طرح حل کر سکتے ہیں جس طرح دوسرے اختلافات کو حل کیا کرتے ہیں۔ کوئی معاشرہ جو انسانوں پر مشتمل ہو، ایسا نہیں ہو سکتا جس میں زندگی کے مختلف مسائل کے متعلق مختلف نظریے نہ پائے جاتے ہوں۔ لیکن ان اختلافات کو کہیں بھی ایسی رکاوٹ بننے کی اجازت نہیں دی جاتی کہ وہ زندگی کی گاڑی کو آگے چلنے ہی نہ دیں۔ اختلافات کو حل کرنے کا جمہوری طریقہ یہ ہے کہ ریاست کا نظام اُس نقطہ نظر کے مطابق چلایا جائے جس کو اکثریت قبول کرتی ہو، اور قلیل النعداد گروہوں کے نقطہ نظر کی زیادہ سے زیادہ اتنی رعایت کی جائے جس کی اصول میں گنجائش ہو۔ نیز اقلیت کی حیثیت سے اُن کے حقوق کا متصفانہ تحفظ کر دیا جائے ہم کوشش کریں گے کہ پاکستان کی ریاست اسلام

لے وقت کی کمی کے سبب سے اُن اقتصادی مسائل پر روشنی نہیں ڈالی جا سکی جنہیں مسائل نے اپنے سوال میں چھیڑا تھا۔ ان مسائل پر تفصیلی گفتگو کے لیے ملاحظہ فرمائیے کتاب ”سود“ اور انسان کا معاشی مسئلہ۔ ریاست کا اسلامی حل۔“

کے اُن وسیع ترین اصولوں پر قائم ہو جن پر مسلمانوں کے درمیان زیادہ سے زیادہ اتفاق پایا جاتا ہے۔ تاہم کچھ ایسے گروہ باقی رہ سکتے ہیں جو ان وسیع ترین اصولوں میں بھی اکثریت کے ساتھ متفق نہ ہوں۔ اس صورت میں ہم کو وہی جمہوری طریقہ اختیار کرنا پڑے گا جس کا ابھی میں ذکر کر چکا ہوں۔ ورنہ یہ بالکل ایک عجیب بات ہوگی کہ ہم سب غیر اسلام پر اس لیے اتفاق کریں کہ اسلام پر ہم متفق نہ ہو سکے۔

مسلمانوں کے اندرونی اختلافات کے علاوہ ریاست پاکستان میں اقلیتوں کا مسئلہ بھی قابل غور ہے۔ آپ کس طرح اُن کو اس بات پر راضی کر سکتے ہیں کہ وہ مسلمانوں کی مذہبی ریاست کا قیام گوارا کر لیں اور اس کے وفادار رہیں؟

ہم۔ اس گنتی کا اصل بھی وہی ہے جو مسلمانوں کے اندرونی اختلافات کا ہے۔ جمہوری طریقہ پر ایک ملک کا نظام انہی اصولوں کے مطابق بنتا اور چلتا ہے جو اکثریت کی رائے میں صحیح ہوں۔ اقلیت یہ مطالبہ ضرور کر سکتی ہے کہ اُس کے نقطہ نظر پر بھی غور کیا جائے، نیز یہ کہ اس کے حقوق شہریت اور اس کے پرسنل لا کو محفوظ رکھا جائے۔ لیکن از روئے انصاف وہ یہ مطالبہ نہیں کر سکتی کہ اکثریت اُس کی خاطر اپنی رائے بدل دے۔ اس ملک کی اکثریت ایمانداری کے ساتھ یہ رائے رکھتی ہے کہ اسلام کے اصولوں کی پیروی میں پاکستان کے باشندوں کی فلاح ہے۔ اُس کو یہ حق حاصل ہونا چاہیے کہ ملک کا نظام اُس کی اس رائے کے مطابق بنے۔ اقلیت اُس سے اپنے حقوق کا تحفظ مانگ سکتی ہے، مگر یہ کہنے کا اُسے حق نہیں ہے کہ اکثریت اسلام کے بجائے کچھ دوسرے اصولوں میں اپنی فلاح تلاش کرے۔ رہا وفاداری کا سوال تو حقیقت یہ ہے کہ وفاداری کا تعلق کسی ریاست کے مذہبی یا غیر مذہبی ہونے سے نہیں ہے، بلکہ وہ اُس انصاف، شرافت اور فیاضی پر منحصر ہے جو اکثریت کی طرف سے اقلیت کے ساتھ برتنی جلسے آپ اقلیت کو محض اس یہاں کاری سے مطمئن نہیں کر سکتے کہ دیکھو ہم نے تمہاری خاطر اپنے مذہب تک کو چھوڑ دیا اور ایک غیر مذہبی ریاست بنالی۔ اقلیت تو یہ دیکھے گی کہ آپ اس کے ساتھ انصاف کرتے ہیں یا نہیں؟ آپ کا بڑاؤ تعصب اور تنگ دلی پر مبنی ہے یا رواداری اور فیاضی پر؟ یہی تجربہ دراصل فیصلہ کرے گا کہ اقلیت کو اس ریاست میں وفادار بن کر رہنا ہے یا بیزار بن کر۔

ہیں۔ میری رائے میں ہر ملک کا سیاسی نظام اُس کے باشندوں کے رسم و رواج، اخلاق، عادات و خصائل اور اعتقادات و قہمات کا پر تو ہوتا ہے۔ ریاستی نظام بجا ہے خود کسی فلسفے یا مذہب کا حامل نہیں ہو سکتا۔ اگر اسے ایسا بنانے کی کوشش کی جائے تو وہ ایک مصنوعی اور عارضی کوشش ہوگی۔ قدیم یونان کی شہری ریاست افلاطون کے تخیل کی پیداوار نہیں تھی بلکہ اُس انداز فکر اور فلسفہ زندگی کی پیداوار تھی جو یونان کے باشندوں میں مشترک تھا۔ اسی طرح اگر ہم اسلامی ریاست کی تعمیر چاہتے ہیں تو ہمیں چاہیے کہ پاکستان کے باشندوں میں صحیح اسلامی سپرٹ پیدا کریں اور انہیں دین کی اصلی اقدار سے روشناس کرائیں جب یہ اقدار مضبوط ہو جائیں گی اور ہمارے قومی کیرکٹر میں اسلامی تصورات پوری طرح سراست کر جائیں گے، اُس وقت ہمارا سیاسی نظام خود بخود اسلامی رنگ اختیار کرے گا۔ ہم اُس وقت تک اسلامی ریاست کی مانع ہیل نہیں ڈال سکتے جب تک ہماری روحانی، شخصی، اور سماجی زندگی میں اسلامی روایات پوری تابندگی سے جلوہ گر نہ ہوں۔ میری نظر میں وہ وقت ابھی دُور ہے جب ہم مکمل طور پر اسلامی تصورات کو قبول کر لیں گے۔ اس لیے اسلامی ریاست کو قائم کرنے کی تمام کوششیں پیش از وقت ہیں۔ ہماری بنیادیں ابھی اتنی استوار نہیں ہیں کہ ہم ان پر ایک عمارت کھڑی کر سکیں۔

م۔ آپ نے سچ فرمایا کہ ایک ملک کا سیاسی نظام اُس کے باشندوں کی اخلاقی اور ذہنی حالت کا پر تو ہوتا ہے۔ اب اگر پاکستان کے باشندے اسلام کی طرف ایک پُر زور میلان رکھتے ہیں اور اُن کے اندر اسلام کے راستے پر آگے بڑھنے کی خواہش موجود ہے تو کیوں نہ اُن کی قومی ریاست اُن کے اس میلان اور اس خواہش کا پر تو ہو؟ آپ کا یہ ارشاد بھی بالکل درست ہے کہ اگر ہم پاکستان کو ایک اسلامی ریاست بنانا چاہتے ہیں تو ہمیں پاکستان کے باشندوں میں اسلامی شعور، اسلامی ذہنیت اور اسلامی اخلاق پیدا کرنے کی کوشش کرنی چاہیے۔ مگر میں نہیں سمجھا کہ اس کوشش میں حصہ لینے سے آپ خود ریاست کو کیوں مستثنیٰ رکھنا چاہتے ہیں۔ ۵ اراگست ۱۹۷۹ء سے پہلے کی صورت حال تو یہ تھی کہ ہمارے اوپر ایک غیر مسلم اقتدار مسلط تھا، اس وجہ سے ہم اسلامی خطوط پر اپنی ملت کی تعمیر میں ریاست اور اس کی طاقتوں اور اس کے ذرائع سے کوئی مدد نہیں پا رہے تھے، بلکہ حقیقت اس وقت ریاست

کا پورا ادارہ اپنے زور سے ہمیں ایک دوسری طرف کھینچنے لگے جارہا تھا اور ہم انتہائی ناسازگار حالات میں اسلامی زندگی کی تعمیر کے لیے جدوجہد کر رہے تھے۔ اب جو سیاسی انقلاب ۱۵ اگست کو رونما ہوا ہے اس کے بعد ہمارے سامنے یہ سوال پیدا ہو گیا ہے کہ آیا اب ہماری قومی ریاست اسلامی زندگی کی تعمیر میں وہ حصہ لے گی جو ایک معمار کا حصہ ہوتا ہے؛ یا وہ طرز عمل اختیار کرے گی جو ایک بے نیاز خیر جاندار کا ہوا کرتا ہے؛ یا اب بھی وہی پھٹی صورت حال برقرار رہے گی کہ ہمیں حکومت کی مدد کے بغیر ہی نہیں بلکہ اس کی مزاحمت کے باوجود اسلامی زندگی کی تعمیر کا کام کرنا ہوگا؛ اس وقت چونکہ پاکستان کا آئندہ نظام زیر تشکیل ہے اس لئے ہم چاہتے ہیں کہ ایسی ریاست بن جائے جو اسلامی زندگی کی معمار بن سکے۔ ہماری یہ خواہش اگر پوری ہو گئی تو ریاست کے وسیع ذرائع اور طاقتوں کو استعمال کر کے پاکستان کے باشندوں میں ذہنی اور اخلاقی انقلاب برپا کرنا بہت زیادہ آسان ہو جائے گا۔ پھر جس نسبت سے ہمارا معاشرہ بدلتا جائے گا اُسی نسبت سے ہماری ریاست بھی ایک مکمل اسلامی ریاست بنتی چلی جائے گی۔

۱۸ مئی ۱۹۴۸ء